Majallah Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 38, Sr.No.107, 2017 pp 37 - 50

مجلّہ تحقیق
مجلّہ کلیۂ علومِ شرقیہ
جلد ۳۸، اپریل۔ جون ۲۰۱۷ء، شمارہ ۱۰۷

اشفاق احمد کے صوفیانہ نظریات کے تشکیلی عوامل کا تحقیقی پس منظر

سیّدہ طیبہ رباب☆

Abstract:

Ashfaq Ahmad was born to a religious family but he felt loneliness and wanted to know about the wisdom of the east. He used to meet various Sufis and expressed his deep and rich ideas about Sufism in Urdu literature. He was not a Sufi but had a spiritual approach and was a unique person. He had the great love for humanity which is reflected through his short stories, dramas, Zavia and interviews. He was the beloved personality being a great writer.

اشفاق کی تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی۔ انسانیت سے محبت، بے نام دکھ، تنہائی کا احساس اور نامعلوم کی جستجو شروع ہی سے طبیعت کا حصہ تھی۔ ابتدائی افسانوں میں بھی تصوّف کی طرف جھکاؤ ہے۔ قیامِ روم کے دوران میں دانشِ مشرق کے متعلق جاننے کا تجسس پیدا ہوا۔ مختلف بابوں کے ڈیروں پر جاتے رہے۔ قدرت اللہ شہاب جو سلسلہ اویسیہ کے پیرو تھے اور نائنٹی کی راہنمائی میں انھوں نے اپنا روحانی سفر جاری رکھا۔ اشفاق احمد کے قریبی دوست تھے۔ اشفاق کو قدرت اللہ کی سادگی اور انکساری پسند تھی۔ قدرت میں سی۔ ایس۔ پی آفیسر والی پھوں پھاں نہیں تھی۔ پھر آہستہ آہستہ یہ دوستی، روحانی تعلق میں بدلتی گئی۔ اشفاق احمد انتہائی خوش گفتار ہونے کے باوجود اپنے کچھ معاملات راز ہی رکھتے۔ وہ کبھی ظاہر نہ کرتے کہ انھیں قدرت اللہ شہاب سے کوئی ارادتمندی ہے اگرچہ ان کے قریبی دوست جانتے تھے۔ بانو قدسیہ نے مردِ ابریشم میں قدرت اللہ شہاب سے اپنے خاندان کے تعلقات کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

☆ لیکچرار اُردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد

خالد سنجرانی کہتے ہیں:

> ’’داستان گو عجائب گھر کی یہ نچلی منزل عام افراد کے لیے نہیں کھلتی۔ اس منزل کا در کسی کسی کے لیے وا ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے اس منزل کی سیر کی ہے ان کا کہنا ہے کہ اس منزل کی سب سے نادر شے قدرت اللہ شہاب ہے۔ اس کم یاب موتی کی موجودگی نے داستان گو عجائب گھر کی پہلی منزل کو باوقعت اور قابلِ دید بنا دیا ہے۔‘‘(۱)

شہاب کا جب بھی لاہور میں قیام ہوتا تو اشفاق احمد کے ہاں ٹھہرتے۔ اکٹھے بازار جاتے، درباروں میں جاتے، بابوں کے ڈیروں پر جاتے، بچوں پر بھی قدرت اللہ کا خاص اثر تھا۔ بانو قدسیہ اکثر اپنے بچوں سے کہتیں کہ جب شہاب بھائی آئیں تو آپ لوگ ان کے پاس ہی رہا کریں۔ داستان سرائے، میں کاسنی کمرہ، قدرت اللہ شہاب کے لیے مخصوص تھا۔ شہاب کے پاؤں کے انگوٹھے کے ناخن اندر کی طرف بڑھ جاتے جنھیں اشفاق بڑی محبت سے تراشا کرتے تھے ناخن تراشنے کا سارا سامان بڑے اہتمام سے جمع کر رکھا تھا۔ ابتدا میں بانو قدسیہ نے اشفاق کو منع کیا کہ یہ کام ڈاکٹر کا ہے۔ آپ زمین پر بیٹھ کے ناخن تراشتے ہیں آپ کا بھی کوئی مقام ہے لیکن پھر ان کی بھی کایا پلٹی اور شہاب کے جاتے ہی اشفاق سے کہتیں کہ ان کے ناخن چیک کر لیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ ’’مردِ ابریشم‘‘ میں لکھتی ہیں کہ ایک بار شہاب بھائی نے کہا کہ اشفاق باقاعدگی سے بابا نور کے ڈیرے جاتا ہے۔ یہ بابے بڑے ڈاڈے ہوتے ہیں یہ پیار سے کھوئی ہوئی بھیڑوں کو راستے پر ڈال دیتے ہیں پھر بھیڑیں جانیں اور بھیڑوں کا رکھوالا۔ یہ پروا نہیں کرتے:

> ’’شہاب بھائی کے جانے کے بعد مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ وہ بھی بڑے ڈاڈے تھے انہوں نے بھی اشفاق خان صاحب کے ساتھ اچھی کی........ پریت سے ناخن کٹوائے۔ بن بولے تشکر سے موم کیا........ بھیڑ کو جنگلوں کے راستے پر ڈالا اور اپنے کندھے پر بھورا ڈال رخصت ہو گئے۔ میں ان دونوں کے اندرونی رابطے کو نہیں سمجھ سکی شاید کچھ کچھ تھا۔ شاید نہ تھا۔‘‘(۲)

ایک بار اشفاق نے کہا تھا کہ میں شہاب کا واحد خلیفہ ہوں انھوں نے خود اپنی زبان سے دو مرتبہ واشگاف الفاظ میں بیان دیا تھا کہ اشفاق میرا خلیفہ ہے لیکن اس پر بڑی لے دے ہوئی اور اشفاق کے ساتھ ساتھ قدرت اللہ شہاب کی مخالفت بھی کی گئی۔

اشفاق احمد صوفی برکت علی کے ڈیرے پر گئے تو ان کی خدمتِ خلق سے بہت متاثر ہوئے۔ نور والوں کے ڈیرے پر ان کا سب سے زیادہ آنا جانا رہا اور سائیں فضل شاہ کے خیالات اور ان کے اقوال اشفاق احمد کے ڈراموں میں بھی نظر آتے ہیں۔ انیس ناگی رقم طراز ہیں:

> ’’ان کے مرشد سائیں فضل شاہ نور والے تھے جن کے روحانی معجزوں سے وہ بہت متاثر

> تھے۔ وہ اس خیال کے حامل ہیں کہ باطن کی صفائی اور خدا تک پہنچنے کے لیے ایک بابے کی ضرورت ہے، حیرت اس بات کی ہے کہ اشفاق احمد جن بابوں کے سنہری اقوال درج کرتے ہیں وہ عام سی باتیں ہیں جو تصوّف کی کسی کتاب میں مل جاتی ہیں۔''(۳)

وہ باتیں تصوّف کی کتاب میں تو مل ہی جاتی ہیں لیکن ان کا آج کے انسان میں زندہ اور متحرک ہونا قابلِ ذکر اور اہم ہے۔ بابا جی نور والے کہا کرتے کہ وہ ماضی جھوٹ ہے جس کا حال شاہد نہ ہو۔ نیز یہ کہ اشفاق سائیں فضل کے معجزوں سے نہیں ان کے کردار سے متاثر تھے اور ہو بھی تو اسے معجزہ نہیں کرامت کہتے ہیں۔ سائیں فضل کے انتقال کے بعد ان کے خاندان اور دوستوں میں اختلافات پیدا ہوئے تو اشفاق سخی رازی کے ڈیرے پہ جاتے رہے جو سندھی تھے۔ اشفاق ان کے لب و لہجے سے بہت متاثر تھے۔ بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

> ''ہم دونوں نہر سے ہو کر سخی رازی صاحب کے ڈیرے پر پہنچے۔ بابا جی نور والے جیسے انتظام تو نہ تھے نہ ویسے مخلوق ہی جمع تھی۔ ڈیرے پر سخی رازی صاحب کی دانش رس رہی تھی۔ پیاسی زمین جیسے لوگ سیراب ہو رہے تھے۔''(۴)

سخی رازی سے ہوتے ہوئے خان صاحب، واصف علی واصف صاحب تک پہنچے۔ واصف صاحب ان کے پاس اپنی کتاب ''شبِ چراغ'' کا ہر مضمون لکھوانے اردو بورڈ آئے تھے۔ ''خاں صاحب نے جلد ہی ان کی وسعتِ نظر کو بھانپ لیا۔ پورے تین ساڑھے تین سال خاں صاحب اور انیق بیٹا ان کی محفلوں میں جاتے رہے۔ یہ محفلیں والٹن کی جانب ایک سکول میں منعقد ہوتی تھیں۔''(۵)

انھی محفلوں کو کتابی صورت میں ''گفتگو'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ واصف علی واصف اشفاق احمد کو کہتے کہ نفس کو ذلیل کرنے سے راستہ ملتا ہے کبھی انھیں ٹاٹ کا سوٹ پہننے اور کبھی ڈھول بجانے کا مشورہ دیتے اشفاق احمد تیار بھی ہوتے لیکن عین وقت پہ آ کے وہ ایسا نہ کر پاتے۔

اشفاق احمد، سید سرفراز شاہ سے بھی ملتے رہے جو سلسلۂ چشتیہ کے جوان بزرگ تھے۔ ان سے ملاقات ممتاز مفتی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ ''خان صاحب جب تک ہم لوگوں میں رہے۔ سرفراز شاہ صاحب کا رشتہ خاں صاحب سے نہیں ٹوٹا۔ وہ لندن سدھارے تو وہاں سے خاں صاحب کے نام شاہ جی کے خط آتے رہے۔ سرفراز شاہ صاحب چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ تھے اور بڑی فرموں میں پورے طور پر ان کا فنانس ڈیپارٹمنٹ سنبھالتے تھے لیکن کہیں ان کے اندر ایسی تڑپ، تلاش اور ناآسودگی ضرور تھی جو انھیں ایک ان پڑھ مرشد کے پاس لے گئی یہ مرشد انارکلی کے دہانے پر مسجد کے پیچھے گلی میں رہتے تھے۔ ان ہی مرشد صاحب نے شاہ جی کی تربیت کی اور انھیں کشف کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا اور خلق کی خدمت کی پڑیا چٹا دی۔''(۶)

اشفاق احمد ساڑھے گیارہ صوفیوں سے ملے ہیں جو بہت طاقتور تھے۔ ایک صرف اچھا بولتے تھے

باقی سب خاموش طبع تھے۔ اشفاق نے صوفیا کو قریب سے دیکھا تو انھیں بڑی حیرت ہوئی کہ یہ لوگ دوسرے لوگوں سے برتر ہیں۔ کہتے ہیں میں تیرہ سال انہیں چھپ کے دیکھتا رہا کہ ان کی کوئی کمزوری پکڑوں لیکن نہیں پکڑ سکا۔ انھیں کوئی رہنمائی حاصل ہوتی ہے کوئی تائید ہوتی ہے صرف کرامت نہیں۔ اشفاق کرامت کو چھوٹی چیز سمجھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ کرامت تو مجھ جیسا بندہ بھی اگر فارغ ہو تو شاید دکھا لے۔ اشفاق کا کوئی ذاتی طور پر روحانی تجربہ نہیں لیکن صوفیا کے علاوہ جن لوگوں سے کوئی ایک کرامت ظاہر ہو یا کوئی تجلی ظہور پذیر ہو، متعارف ہیں۔ اپنے ایک دوست کا بتاتے ہیں جو شرقپور کا رہنے والا تھا۔ رات کو اس نے دیکھا کہ بیری کے درخت سے ایک روشنی نکل کر اس کی طرف آرہی ہے جو تجلی تھی۔

دراصل تجلی یا کرامت کا ظہور صرف انسان کو روحانیت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے یا دنیا کی بے مائیگی کا احساس دلانے کے لیے ہوتا ہے۔ بجائے خود تجلی یا کرامت اہم نہیں بلکہ اصل مقصود انسان کو خدا کی طرف مائل کر کے ایسا مضبوط کردار تشکیل دینا ہے جو باطل کو خاک میں ملانے اور کائنات کو تسخیر کرنے کی طاقت رکھتا ہو جس کا تصوّر اقبال نے مردِ کامل کی صورت میں دیا ہے۔ یہ کردار ہی حق کی تجلی ہے جیسا کہ اقبال نے کہا ہے:

زندہ حق از قوتِ شبیری است
باطل آخر داغِ حسرت میری است(۷)

اشفاق احمد نے کبھی صوفی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ان کا کہنا ہے:

> ”میں صوفی نہیں بن سکا، صوفی کی سطح زمین سے تھوڑی اونچی ہوتی ہے۔ میں تو گلیوں میں چلنے والا آدمی ہوں۔ کاش میں ایسا ہو سکوں اور مرنے سے پہلے دو دن بھی ایسے مل جائیں تو بڑی خوشی کی بات ہے۔“(۸)

اشفاق احمد کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں صوفی تو وہ ہیں اگرچہ انھیں ولی کامل نہیں کہا جا سکتا نہ وہ ہیں اور نہ ہی دعویٰ کرتے ہیں لیکن زندگی بھر دوسروں کو آسانیاں فراہم کرنے والا بابا صوفی نہیں تو اور کیا ہے۔

سائیں فضل شاہ نور والے کو اشفاق اپنا مرشد تسلیم کرتے ہیں۔ ایک دن وہ اردو سائنس بورڈ کے دفتر میں بہت افسردہ اور غمگین بیٹھے تھے کہ حنیف رامے انھیں سائیں فضل شاہ کے پاس لے گئے۔ دھرم پورہ میں ان کا ڈیرہ تھا۔ فضل سائیں ہر کسی کا خوش دلی سے استقبال کرتے لنگر جاری رہتا۔ لوگوں کی الجھنیں دور کرتے۔ آنے والے دکھوں کی دوا اور درد کی شفا لے کے جاتے۔ آہستہ آہستہ اشفاق کی اس ڈیرے پہ آمد بڑھ گئی انھوں نے سائیں فضل کی حکیمانہ گفتگو سے بہت کچھ سیکھا۔ کتابوں کے انتساب ان کے نام کیے اور سائیں فضل کی دانش و حکمت سے بھرپور گفتگو کو اپنے ڈراموں کے مکالمات میں شامل کیا۔ سائیں فضل کے طرزِ گفتگو سے اشفاق بہت متاثر تھے کچھ اور پڑھے لکھے لوگ بھی ان سے متاثر ہوتے۔ اس ڈیرے پر اعجاز

بٹالوی، حبیب جالب اور بہت سے لوگ جاتے۔ قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی جب اسلام آباد سے لاہور آتے تو ڈیرے پہ ضرور جاتے۔ سائیں فضل اَن پڑھ تھے انھوں نے بکریاں پالی ہوئی تھیں لیکن ان کا علم سائنسدان کی طرح بلکہ ایک لحاظ سے اس سے بھی بڑھ کر تھا کہ سائنسدان اپنے تجربے میں ڈھل نہیں سکتا جبکہ صوفی خود کو اپنے تجربے میں ڈھال لیتا ہے، جسے اشفاق ''کایا کلپ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ انھیں مرشد سے وہ علم ملا جو اور کہیں سے نہیں مل سکتا تھا۔ اشفاق احمد اپنی تحریروں میں ڈیروں کا ذکر بالخصوص نور والوں کے ڈیرے کا ذکر کرتے ہیں جہاں روحیں تسکین پاتی ہیں۔ بھٹکے ہوؤں کو رہنمائی ملتی ہے۔ مضطرب سکون پاتے ہیں۔ اشفاق کے ''بابے'' خاص قوت کے حامل ہیں۔ کچھ ذہنوں میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ''بابے'' آخر ڈیرون والے ہی کیوں ہیں کوئی ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر، کوئی بزنس مین بھی تو بابا ہوسکتا ہے۔ اشفاق احمد خود ڈیروں پر جاتے رہے اور ڈیروں سے روحانیت کو منسوب کیا کہ وہاں سادہ اور فطری ماحول ہوتا ہے تکلفات کے جھنجھٹ نہیں ہوتے۔ اس لیے بھی کہ ڈیرے با آسانی دستیاب ہیں۔ ویسے مذکورہ بالا تمام کردار ''بابوں'' کی صورت میں اشفاق احمد کے ڈراموں اور افسانوں میں موجود ہیں۔ ڈیروں میں بھی ایک غلط فہمی کی گنجائش ہے کہ مصنوعی عامل بھی ڈیرے جمائے بیٹھے ہیں جو شعبدہ بازیاں کرتے ہیں اور شیطانی طاقت استعمال کرتے ہیں لیکن اشفاق احمد نے وضاحت بھی کی ہے کہ میں نے حقیقی ''بابوں'' کے ڈیروں کی بات کی ہے جو خواہشات پر قابو پانے کے سبب اللہ کے مقرب بندے ہوتے ہیں اور ڈیرے صرف خدمتِ خلق کا ذریعہ ہیں۔ اشفاق ''بابا'' کی تعریف یہ بیان کرتے ہیں کہ جو دوسروں کو آسانی دے وہ ''بابا'' ہے اور جو آسانی نہ دے وہ ''بابا'' نہیں ہوسکتا۔ بابے انسانیت کے بہت قریب ہوتے ہیں اشفاق احمد کہتے ہیں:

> ''یہ میں تصوّف کی بات کر رہا ہوں۔ جو شخص گروہ انسانی کے قریب جائے گا اس کو مقناطیسی قوت سے طاقت ملے گی جس سے اس کی کمزوریاں دور ہونے لگیں گی۔''(۹)

اشفاق کا کہنا ہے کہ بابوں سے وہ کچھ ملتا ہے جو دنیا بھر کی یونیورسٹیوں سے نہیں مل سکتا۔ ویسے اقبالؒ کا کہنا ہے جو کچھ انسان کو اپنے من سے ملتا ہے وہ کہیں سے نہیں ملتا لیکن من کی طاقت کو پانے والے لوگ تو بہت ہی کم ہوا کرتے ہیں۔ اشفاق نے تھوڑا نیچے آ کر عام انسان کے درد کا درماں یہ بتایا ہے کہ بابوں سے ملتے رہیں وہ کچھ نہ کچھ عطا کرتے رہتے ہیں۔ رسمی تعلیم صرف ذہن کو متحرک کرتی ہے اور انسان کو بے یقین صحرا کی جھلستی ریت پر تڑپتا چھوڑ دیتی ہے جبکہ رُوحانی علوم ٹھنڈی چھاوں اور صحراؤں میں نخلستان کی مانند ہیں لیکن ان کے ادراک کے لیے شفاف دل اور چشمِ بصیرت درکار ہے جبھی تو حکیم الامت نے فرمایا تھا:

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں (۱۰)

روح کے ادراک میں دنیاوی جاہ وحشم، مال ودولت یا رسمی تعلیم کی ڈگریاں اہم نہیں۔ یہ سب تو اپنا آپ منوانے کے لیے ہے۔ اپنا آپ منوانے والے تو ہر واقعے کو ظاہری آنکھ سے دیکھتے ہیں بصیرت سے محروم اور مادی مفادات میں الجھے ہوئے لوگ ہوتے ہیں سوائے ان لوگوں کے جن پر کوئی خاص نظرِ کرم ہو۔ انھیں منصب ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ روح کا ادراک تو ذات کی نفی کا متقاضی ہے۔ جب تک افراد کی انائیں آپس میں بھڑتی رہیں روح کا احساس بیدار نہیں ہوسکتا یہ تب ہوگا جب کوئی فرد ہار مان لے۔ پھر اس پہ اسرارِ نہانی کھلتے چلے جاتے ہیں۔ علمِ معرفت حاصل ہوتا ہے۔ روحانی علوم روح کی پاکیزگی کا نتیجہ ہوتے ہیں جو واردات قلبی کی صورت ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اشفاق احمد اکثر سائنسدان اور صوفی کا موازنہ کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ سائنس کا دور ہے اور سائنس کی مدد سے ایک پڑھا لکھا فرد روحانیت کو کچھ نہ کچھ سمجھ سکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ سائنسدان اپنے پیشہ کے ساتھ مخلص ہوتا ہے وہ نہ تو جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور نہ ہی بلا سوچے سمجھے، بغیر مشاہدہ اور تجربے کے کسی چیز یا نظریے کی تردید کرتا ہے۔ صوفی کا علم کسی کتاب سے نہیں ملتا نہ اس کی کوئی ڈگری ہے نہ اس کے غلط استعمال کی اجازت ہوتی ہے ورنہ علم ضبط کر لیا جاتا ہے۔ ظاہری علوم تو سستے داموں فروخت ہوتے ہیں۔ ان سے صرف روزگار اور مادی مفادات حاصل کیے جارہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر مادی علوم بھی خلوصِ نیت سے حاصل کیے جائیں انھیں مکروفریب، چالاکی، مفاد پرستی، خود پسندی اور غرور وتکبر کا ذریعہ نہ بنایا جائے تو یہ علوم بھی انسان کی روحانی ترقی کا باعث بن جاتے ہیں لیکن اس کے لیے تطہیرِ قلبی کی ضرورت ہے کہ انسان دل کو آلائشوں سے پاک رکھے اور خواہشات کے جال میں نہ پھنسے نہ ان کی طرف ملتفت ہو تو تمام علوم کا باطنی عرفان حاصل کرسکتا ہے۔ مگر ایسا شاذونادر ہی ہوتا ہے۔ علومِ ظاہر عموماً تکبر کا باعث بنتے ہیں اسی لیے اولیا نے علم کی مخالفت کی جو بابا بلھے شاہ اور سلطان باہو اور امام خمینی کے ہاں نظر آتی ہے۔ حتیٰ کہ قرآنی علوم بھی بغیر معرفت کے کارآمد نہیں۔ تلاوتِ قرآن باعثِ برکت تو ہے لیکن ایک حد تک، اس کے بعد انسان اس سے فیض یاب نہیں ہوسکتا جب تک معرفت پا کر اس پر عمل پیرا نہ ہو۔ طوطے کی طرح رٹہ لگانے والوں نے کبھی تاریخ میں کوئی کارنامہ سرانجام نہ دیا بلکہ شیطان کے آلہ کار بن گئے۔ جب واقعۂ کربلا برپا ہوا تو کہاں تھے وہ علماء امت جن کے تقدس کی کہانی ختم ہونے کو نہیں آتی جو سستے داموں بک گئے اور یزید کے خلاف فتویٰ نہ دیا اور نہ ہی اہلِ بیتؑ کا ساتھ دیا بنو اُمیہ بدستور حکومت پر قابض رہے اور ایسی تاریخ رقم کر گئے کہ امتِ مسلمہ غیر مسلموں کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہ رہی اور وہ حفاظِ قرآن کیا ہوئے جو قرآن ناطق کے مقابل صف آرا ہوگئے سلطان باہو کہتے ہیں:

جے کر دین علم وچ ہندا، تے سر نیزے کیوں چڑھدے ہو!
اٹھارہ ہزار جے حافظ ہندے، تے اَگے حسینؑ دے مر دے ہو!(۱۱)

اشفاق کا خیال ہے کہ زندگی میں رہبر کامل یا مرشد کی ضرورت ہوتی ہے۔ مرشد کے بغیر علم عطا

نہیں ہوتا جیسے سائنسدان کو بھی مرشد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح میڈیکل کے طالبِ علم کو سینئر سرجن کی رہنمائی درکار ہوتی ہے۔ انسان ماں باپ کے وسیلے سے مادی وجود پاتا ہے اور بچپن میں اپنی ضروریات کے لیے دوسروں کا محتاج ہوتا ہے اور زندگی بھر کسی نہ کسی رشتے کا محتاج رہتا ہے اسی طرح روحانی پرورش کے لیے بھی اسے وسیلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اشفاق احمد کہتے ہیں:

> ''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کتاب سے علم نہیں آتا کتاب کے ساتھ ایک نبی ضروری ہے اگر اللہ چاہتا تو دھاگے سے قرآنِ پاک کو باندھ کر ہر جگہ پہنچا دیتا۔ وہ ایسا کرنے پر قادر ہے مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔'' (۱۲)

کوئی بھی ذی شعور اور فلاح کا متمنی انسان کتاب اللہ کو ہدایت پانے کے لیے کافی نہیں سمجھتا۔ جب تک کوئی کتاب کو سمجھانے والا نہ ہو کتاب ہدایت نہیں دے سکتی کفایت نہیں کر سکتی۔ زندگی میں اسی طرح مرشد کی ضرورت ہے بغیر مرشد کے انسان فلاح نہیں پا سکتا۔ اشفاق احمد نے بڑے سادہ اور دلفریب انداز میں دورِ حاضر کے الجھے ہوئے، بے سمتے، مضطرب اور پریشان حال انسان کو روحانی ضرورت کی صرف متوجہ کیا ہے۔

> ''انسان میری سوچ کے مطابق تین سٹوری والی بلڈنگ ہے اس کا ایک حصہ روٹی، کپڑا اور مکان ہے۔ اوپر کا چوبارہ ذہن کا ہے۔ ذہنی پھیلاؤ کا ہے وہ چاہتا ہے کہ میں رات کو سردی میں کمبل کی بکل مار کے ایک بجے جا کر مشاعرہ سنوں اور کہوں واہ واہ، سبحان اللہ یہ چیز روٹی کپڑا اور مکان کے ذیل میں نہیں آتی۔ اس کے اوپر ایک اور چوبارہ ہے، جو روح کا خانہ ہے جو کہ خالی پڑا ہے۔ اس میں پرانا کاٹھ کباڑ پڑا ہوا ہے۔ جب تک یہ تینوں منزلیں آباد نہ ہوں انسان تڑپتا رہتا ہے۔ تلاش کرتا رہتا ہے۔ اس میں ترقی یافتہ یا ترقی پذیر اور تھرڈ ورلڈ کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ ہر بندہ جو انسان کی ساخت پر آیا ہے تو وہ ضرور مانگے گا۔ مغرب نے کوشش کی کہ ہم دوسری منزل یعنی انٹیلکٹ (Intellect) کی حد تک تو مان لیتے ہیں لیکن روحانیت کی منزل کو نہیں مانتے۔ آپ دیکھ لیں وہ سخت بے چینی کے عالم میں پھنسے ہوئے ہیں۔ بس میری آرزو ہے کہ اس پورے کے پورے انسان کی سیر کی جائے۔'' (۱۳)

اشفاق احمد عوامی توقعات کے مطابق نہیں لکھتے جیسے ڈاکٹر شوگر کے مریض کو مٹھائی کھانے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔ اسی طرح وہ انسان کے زخمی وجود کے لیے مرہم تلاش کرتے ہیں۔ اسے ایسی کہانیاں نہیں سناتے کہ وہ زخم کو بھول جائے بلکہ اسے ہوش دلاتے ہیں کہ زخم کا علاج ضروری ہے ورنہ بڑھ کر ناسور بن جائے گا۔ اس مقصد کے لیے کبھی ان کا جھکاؤ ایک طرف زیادہ بھی ہو جاتا ہے اور ان کا کہنا ہے کہ ایسا میں قاری کو جھٹکا دینے کے لیے کرتا ہوں کہ احساس بیدار ہو اور غلطی کو تسلیم کیا جائے اور انسان تیسرے چوبارے کی لگن کے متعلق جاننے کی کوشش کرے۔ روحانی لگن کے لیے اشفاق احمد ہر روز باقاعدگی سے تھوڑی دیر کی

خاموشی اور تنہائی کو ضروری سمجھتے ہیں جیسا ''زاویہ'' میں وہ اکثر کہتے کہ مغرب کی نماز کے بعد دیوار کے ساتھ ڈھو لگا کر بیٹھ جاؤ اس کے لیے فرش پر بیٹھنا ضروری ہے اور اپنے دکھوں کی اور سوچوں کی گٹھڑی اللہ کے سپرد کر کے کہو کہ میں اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ میں تیرے حوالے کرتا ہوں۔ خاموشی کے متعلق کہتے ہیں:

> ''اپنی طاقت کو مجتمع کرنے کے لیے اور بیٹری کو چارج کرنے کے لیے خاموشی کے ساتھ پلگ لگا کر بیٹری کو کارنر میں رکھنا پڑتا ہے اور 24 گھنٹے اس کو دینے پڑتے ہیں کہ وہ ری چارج ہو جائے۔ جب وہ ری چارج ہو جاتی ہے تو پھر اس سے جو مرضی کام لے لیں۔ موٹے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ خاموشی دراصل اپنی ذات کا محاسبہ کرنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ انسان ظالم بادشاہ کا سامنا کر سکتا ہے۔ اپنے آپ کو فیس (Face) نہیں کر سکتا۔''(۱۴)

اشفاق احمد کے صوفیانہ نظریات ادب میں تیسرے چوبارے کی لگن ہیں۔ وہ ادب سے روحانی بیداری کا کام لینا چاہتے ہیں اور ایک خالص اور سچے ادیب ہونے کے ناتے وہ اس میں کامیاب ہیں جب کہ ادبی روایت یہ ہے کہ غیر جذباتی کہانی کو عوام تو کیا دوسرے ادیب بھی پسند نہیں کرتے بلکہ اسے رد بھی کر دیتے ہیں اور طرح طرح کے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ان کا کبھی اس گلی سے گزر ہی نہیں ہوا۔ اشفاق احمد پر بہت سے اعتراضات ہوئے کہ انھوں نے افسانہ چھوڑ دیا، بابوں کے پیچھے چل نکلے، میڈیا میں آ گئے وغیرہ وغیرہ۔ اصل مسئلے پر کوئی غور نہیں کرتا۔ جذباتی مسئلہ روحانی مسئلے کی نسبت بہت چھوٹا، سطحی اور وقتی ہوتا ہے ایسے ادیب دراصل ادب کو محدود کر دیتے ہیں۔ روحِ تصوّف دراصل محبت ہی کی اگلی منزل ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہاں محبت شہوانی یا جذباتی نہیں رہتی بلکہ انسانیت کے بحرِ بیکراں میں جا گرتی ہے اور مرض سے شفا بن جاتی ہے۔ اشفاق کا کہنا ہے کہ گہری محبت انسان کے نظریات بدل دیتی ہے محبت کیا ہے۔ اشفاق احمد کے نقطۂ نظر سے دیکھیے:

> ''محبت کرنے والے سے مراد ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال نہیں ہیں بلکہ وہ محبت ہے جو صلہ و ستائش کی تمنا سے بے نیاز ہو کر خلقِ خدا سے کی جائے۔ میرے ایک بابا ہیں بابا فضل شاہ۔ میں نے ایک بار ٹٹولنے کی غرض سے ایک شخص کے خلاف انہیں انگیخت کیا اور کہا کہ وہ بڑا مکار شخص ہے اور آپ کی عدم موجودگی میں آپ کو ‘برا بھلا کہتا رہتا ہے اور اب کے اس نے ایسا کیا تو ہم اسے زدوکوب کریں گے۔ بابا نے جواب دیا: ''نہیں، وہ برا آدمی نہیں ہے، وہ صرف علم کی کمی کی وجہ سے ایسا ہے لہٰذا اسے تم برا نہ کہو۔ دیکھیے! یہ محبت کی وہ شکل ہے کہ جب آدمی اس میں ایک بار مبتلا ہوتا ہے تو پھر اسی محبت کی حالت میں وہ فوت ہوتا ہے۔ فوت نہیں ہوتا، امر ہو جاتا ہے۔''(۱۵)

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ جو سمجھتے ہیں کہ اشفاق احمد کو تصوّف سے کوئی واسطہ نہیں نہ ہی وہ صوفی ہیں۔ انھوں نے خود صوفی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا لیکن کسی کی عظمت کو تسلیم کر لینا ہی اعلیٰ ظرفی ہے وہ کچھ نہ کچھ صوفی تو ضرور ہیں جو روحانی فکر و دانش ان کی تحریروں میں بکھری ہوئی ہے۔ جس طرح انھوں نے عصرِ حاضر کے دکھی انسان کا بوجھ ہلکا کیا ہے اور پارہ پارہ انسانیت کو روح کے مرکز کی طرف متوجہ کیا ہے یہ ان کی صوفیانہ عظمت کی دلیل ہے اور پھر ان کا قوم پر یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے صوفیانہ نظریات کو فلسفیانہ اصطلاحات سے بوجھل نہیں کیا بلکہ اسے عام فہم انداز میں پیش کیا ہے کہ ذرا سی سوجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی ضرور ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

اشفاق احمد ایک پہلو دار شخصیت کے حامل ہیں وہ جو کام بھی کرتے اس کے اندر اتر کر پورا تجربہ حاصل کر کے اسے اپنی شخصیت کا جزو بنا لیتے، وہ بالٹی کے پیندے کو تھلے لگانے سے لے کر میکینک کی طرح گھر کی بجلی کے تار ٹھیک کر لیتے۔ موٹر میکینک کا سارا سامان ان کے گیراج میں ہوتا اور وہ موٹریں ٹھیک کر لیتے، گھر بنایا اور سینٹری کا سامان لینے گئے تو آٹھ دِن تک مشاہدہ کرتے رہے اور پھر وہ ہر قسم کی ٹوٹیوں کے بارے میں جان گئے۔ کباب بنانے کا شوق ہوا تو لاہور بھر سے کبابوں کے نسخے جمع کیے اور ایسے منفرد کباب بنائے کہ بقول ممتاز مفتی وہ لاہور کے مشہور ترین کبابیے بن سکتے تھے۔ تصوّف میں دلچسپی ہوئی تو بابوں کے ڈیروں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ادب میں ناول، ڈرامہ، افسانہ، سفر نامہ، تلقین شاہ اور ادبی نشستوں کی رنگا رنگی میں کھو گئے۔ ٹی وی پروگرام ''زاویہ'' میں ہر زاویے سے سوچا اور بولا کرتے۔ ایسی رنگا رنگی میں انھوں نے خود کو کیسا پایا ملاحظہ ہو:

> ''ہمارے صوفیا اسے اپنی ٹرمینالوجی میں ''کثیر المقاصد آدمی'' کہتے ہیں جو روحانیت کی طرف کبھی نہیں آ سکتا کیونکہ اس کا بہت بکھرا ہوا ذہن ہوتا ہے میں نے تصوّف کی جانب بھی جا کر دیکھا اور محسوس کیا کہ منتشر ذہن انسان کی کوئی مدد نہیں کرتا لیکن میرے کام کی جتنی بھی شاخیں نکلتی ہیں وہ ڈرامے کے حوالے سے نکلتی ہیں۔۔۔۔ مجھ میں اب رُوحانیت یا طریقت والی ایک نئی بات آئی ہے۔ میں ایک متجسس آدمی کی طرح اس طرف مائل ہوا ہوں اور اب تک ہوں۔'' (۱۶)

کوئی شخص تصوّف کی طرف کیسے مائل ہوتا ہے یہ بڑا اہم سوال ہے کیونکہ مادی زندگی کا الجھاؤ اور خواہش کی پیروی تو انسان کو مقامِ انسانیت سے گرا دیتی ہے۔ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل میں مصروف انسان کی رُوح کا احساس دب کر رہ جاتا ہے اور وہ مشینی پُرزہ بن جاتا ہے۔ اللہ اپنے خاص بندوں کو تو پاک و اطہر پیدا کرتا ہے اور تمام کمالات دے کر دُنیا میں بھیجتا ہے اور ان پر سختیاں بھی زیادہ آتی ہیں۔ جو لوگ رُوح کی پاکیزگی کے ذریعے یہ سفر کرتے ہیں ان کی تین اقسام ہیں۔ کچھ آسائشِ دُنیا یا مادیت کی تکرار سے اُکتا کر

کسی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو حوادث رُوحانیت کی طرف مائل کر دیتے ہیں۔ دُنیا کی بے مائیگی ان پر عیاں ہو جاتی ہے اور رُوح تقویت پکڑنی لگتی ہے۔ غم و حزن تزکیۂ نفس کے لیے نسخۂ کیمیا ثابت ہوتے ہیں۔ تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو زیرِ تربیت رہنے اور اخلاصِ عمل سے معرفت حاصل کرتے ہیں۔ اشفاق احمد کا تعلق پہلی قسم سے ہے لیکن انھوں نے خود کہیں بھی اقرار نہیں کیا بلکہ اِنکار کرتے رہے کہ میں صوفی نہیں ہوں اس کا مطلب ہے کہ کچھ ہے جس کا اِنکار کرتے رہے۔

> ”کاش میں بھیگ سکتا.... ہاں میں خود بالکل صوفی نہیں ہوں نہ مجھ میں اس کی صلاحیت ہے۔ میں پہلی سیڑھی پر کھڑا ہوں۔ مگر میں آپ لوگوں کے مقابلے میں نوازا (Privilliged) ہوا ہوں۔ یہ خدا کا مجھ پر خاص کرم ہے....... میں خود صوفی نہیں۔ ہاں لیکن میں نے صوفیوں کو دیکھا ہے۔ میں ایک متجسس کہانیاں سننے والا لڑکا ہوں اور ایسی موسیقی بھی سن لیتا ہوں جو خارج میں سنائی نہیں دیتی... یہ ایک Unheard باجہ ہوتا ہے بزرگوں سے سنا ہے کہ اس کی تال اور لے کانوں میں آنے لگے تو آدمی نہال ہو جاتا ہے۔ ”آپے کردا نہال نی“ میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ موسیقی کے بارے میں بھی اور بھی... اور ان لوگوں کو بھی جانتا ہوں جن کے پاس چیزیں ہیں یا تھیں۔ میں ان صوفیوں اور بابوں کے جلو میں خوش رہتا ہوں جب کہ لوگ امیر آدمی کے جلو میں ہوں تو خوش ہوتے ہیں مجھے تو کسی بھی صوفی، کسی بھی بابے کی خبر ملے تو میں اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہوں۔“ (۱۷)

اس تلاش کے سفر میں اشفاق احمد نے پہلے صوفیا کے متعلق کتابیں پڑھیں اور انھیں حیرت ہوئی کہ یہ لوگ کیسے زندگی بسر کرتے تھے کہ گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہوتا۔ بادشاہ بخشیش کی قبولیت کے آرزومند ہوتے مگر یہ لوگ اشرفیاں قبول نہ کرتے پھر اشفاق زندہ کرداروں کی تلاش میں نکلے اور ”بابوں“ کے کردار سے بہت متاثر ہوئے۔ دوست احباب ناراض ہوتے رہے کہ ہم جن چیزوں کو رد کر چکے ہیں تم ان کے پیچھے پڑے ہو لیکن وہ ایک طالبِ علم کی حیثیت سے یہ سب جاننا چاہتے تھے پھر ”بابوں“ کے ساتھ نشستیں اور وہ مناظر ان کے لیے یادگار بن گئے ان کے فکر کو بابوں نے مہمیز دی۔ خلوصِ نیت نے چشمِ بصیرت عطا کی اور وہ مادیت اور رُوحانیت کی حقیقت کا اِدراک کرنے کے قابل ہوئے۔

اس مادی دور نے انسان کو ذلت و خواری کے عوض محض آسائشیں فراہم کی ہیں اس کا بنیادی مسئلہ جوں کا توں ہے نتیجتاً انسان پہلے سے زیادہ بے سکون اور اپنی منزل سے دُور ہو گیا ہے۔ اسے اپنی رُوح کی حفاظت کرنا ہو گی ورنہ غلامی اور ناکامی اس کا مقدر ہے اور ناکامی اس طرح دبے پاؤں آئے گی کہ وہ خود کو کامیاب سمجھتا ہی دُنیا سے رُخصت ہو جائے گا۔

وائے نادانی کہ وقتِ مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا (۱۸)

یہ مقامِ فکر ہے کہ انسان کوئی جانور نہیں جو رات دن خواہشات کی تکمیل میں لگا رہتا ہے۔ اِس قدر اندھی دوڑ میں خود کو کھو دیتا ہے۔ ذہنی مرعوبیت اسی غفلت کا نتیجہ ہے ورنہ مسلمان تو کسی غیر سے متاثر ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ڈالروں کی فراوانی بھی بس قبر تک چلے گی اور پھر اندھیری رات میں کوئی روشنی کا ساماں نہ ہو سکے گا۔ اقبال نے کہا تھا:

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی رُوح تری دے کے تجھے فکرِ معاش(۱۹)

اشفاق احمد رُوح کی اس بے سروسامانی میں قوم کے لیے ایک روشنی کی اُمید ہے۔ تھکے ماندوں کے لیے ایک ڈھارس ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آج کے انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ کسی کندھے کی تلاش میں ہے جس پر سر رکھ کر رو سکے لامحالہ وہ کندھا خود اشفاق احمد ہیں ایسا کندھا جو موت کے بعد بھی باقی رہتا ہے اور دُکھی انسانیت جب بھی ڈگمگائے اس کندھے کا سہارا لے سکتی ہے۔ اپنا درد کہہ سکتی کہ وہ اپنی تحریروں میں زندہ ہیں، جواب ضرور ملے گا۔

اشفاق احمد کے نزدیک اِضطراب اس دور کا بڑا مسئلہ ہے جو خواہشات اور اوور انفرمیشن کے سبب جنم لیتا ہے۔ ان کا کہنا ہے ''اِضطراب کا بنیادی طور پر تعلق خواہشات کی ساتھ ہے جتنا خواہشات میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اتنی بے چینی بڑھتی جائے گی۔ تشوِیش میں مبتلا ہو جائیں گے۔''(۲۰) اس لیے وہ خواہش کے کتے کو روٹی کا ٹکڑا ڈال کر دُور رکھنے کی بات کرتے ہیں تا کہ خواہش کی اصلیت کو دیکھ کر انسان اس سے آگے گزر جائے اور اس کی حسرت باقی نہ رہے کہ حسرت زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر اس کتے کو ٹکڑا نہیں ڈالیں گے تو وہ آپ کے ساتھ چمٹ جائے گا اور پاؤں چاٹتا رہے گا۔ جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اس نے فقط آسائشیں دی ہیں۔ جہاز نے فاصلے سمیٹ کر دِنوں کا سفر گھنٹوں میں طے کروا دیا ہے لیکن یہی جہاز جب ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے ٹکراتا ہے تو ساری دُنیا کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے اسی طرح اوور انفرمیشن بھی سکون برباد کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اشفاق احمد کہتے ہیں:

> ''جدید ترین اِطلاعات کا سیلاب انسان کو اِضطراب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ دیکھیں کہ اسلام میں ٹوہ میں لگے رہنے سے منع کیا گیا ہے۔ کسی کے گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ کون آیا کدھر گیا؟ اس بارے میں ٹوہ نہ لگایا کرو۔ اب بھی اِس اِضطراب سے جان چھڑانا چاہتے ہیں تو اوور انفرمیشن سے نکلنا ہوگا۔''(۲۱)

اِس اضطراب کا سبب یہ ہے کہ ہم اِسلام کے اندر داخل نہیں ہیں ہم نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کو عبادت سمجھتے ہیں جب کہ یہ تو اِسلام میں داخلے کی شرائط ہیں جس طرح کسی کلب میں داخلے کی مخصوص شرائط ہوتی ہیں۔ عبادت وہ ہوگی جو ہم اس کلب میں داخلے کے بعد بجا لائیں گے۔ ہم نے تو فقط ارکانِ اسلام پر

اِکتفا کر لیا ہے اور ساری باقی کوشش مادی اور جسمانی زندگی کے لیے ہے جب کہ اللہ کا حکم یہ ہے کہ اِسلام میں پورے داخل ہو جاؤ۔ اشفاق کہتے ہیں:

> ''آج کا پاکستانی زندگی کے جسمانی محاذ پر کامیاب ہے۔ بڑی توجہ اور اِنہماک سے جسمانی زندگی بنا رہا ہے لیکن رُوحانی اور نفسیاتی طور پر پسماندہ ہے کیونکہ انسان ایک حیوان نہیں ہے۔'' (۲۲)

یہ حیوان کی خصلت ہے کہ جس کھیت سے گزرے اِدھر اُدھر منہ مارتا ہے لیکن انسان وہ ہے جسے خود پر قابو ہو، یہ تو بھٹکا جا رہا ہے۔ آج کا نوجوان آزاد نہیں رہا بلکہ یہ مادہ پرستی کے دباؤ میں ہے: عبادت کے متعلق رائے ہے کہ جب تمام مخلوقات عبادت میں داخل ہیں تو انسان کیوں نہیں ہر مخلوق کا اپنی اصل سے اپنے فرائض سے رغبت رکھنا ہی، اس کی عبادت ہے اس میں اس کی ذات رکاوٹ نہیں اسے ذاتی ہوس نہیں درخت پھل دیتا ہے لیکن خود چکھ کر نہیں دیکھتا سورج روشنی دینے کو بے قرار ہے، رات سکون دینے کو، برف پگھل کر پانی بننے کو، یہ تمام ان کی عبادات ہیں۔ انسان کی بے قراری بھی عبادت سے ہی دور ہو گی۔ اشفاق کہتے ہیں:

> ''عبادات اِضطراب کے دوران انسان کے بہت کام آتی ہیں۔ اس لیے کہ نماز اور عبادات اوور انفرمیشن سے نکالتی ہیں..... دیگر مذاہب کے پیروکار بھی عبادات میں ایسا ہی سکون حاصل کرتے ہیں۔ وہ لوگ ہم سے زیادہ عبادات کے لیے وقت نکالتے ہیں۔'' (۲۳)

اشفاق احمد بالوں کو تلاش کرتے رہے اور رُوح کے اِمکانات کا سراغ بھی لگاتے رہے، انھوں نے صحراؤں اور پہاڑوں کے سفر کیے تو ماضی کے جوہر سے رُوح کی شراب کشید کرتے رہے۔ پیغمبروں اور ولیوں کے نقشِ قدم اور ان کے افکار کو اپنی رُوح میں سمو کر فضاؤں میں بکھیرنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ اقبال کی تقلید میں دماغ کی بجائے دل کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ مخالفین کے اعتراضات خاموشی سے سنتے رہے کبھی جواب نہ دیا، جو کچھ انھوں نے کبھی فیض احمد فیض کے لیے کہا تھا وہ تو خود ان پہ صادق آتا ہے:

> ''کبھی اکیلے بیٹھے بیٹھے، خاموش اور چپ چاپ، میں سوچا کرتا ہوں کہ اگر فیض صاحب حضور سرورِ کائنات کے زمانے میں ہوتے تو اُن کے چہیتے غلاموں میں سے ہوتے۔ جب بھی کسی بدزبان، تُند خو، بداندیش یہودی دوکاندار کی درازدستی کی خبر پہنچتی تو حضور کبھی کبھی ضرور فرماتے: ''آج فیض کو بھیجو یہ بھی دھیما ہے، صابر ہے، بردبار ہے، احتجاج نہیں کرتا، پتھر بھی کھا لیتا ہے...... ہمارے مسلک پر عمل کرتا ہے!'' (۲۴)

رُوحانیت کا مسئلہ مادے اور اقتصادیات سے بلند سطح کا مسئلہ ہے۔ رُوح دُنیا بھر کے لوگوں کا

تقاضا ہے جو جغرافیائی حدود میں نہیں رہتی۔ رُوح اَمرِ ربی ہے۔ جس طرح سائنسی ترقی عام ہے، اِسی طرح رُوحانیت بھی عام ہونی چاہیے ورنہ انسانیت یونہی بے چین و بے قرار جاں بلب تڑپتی رہے گی۔ انسانی رُوح اپنی اصل کی طرف مراجعت چاہتی ہی جیسے عاشق معشوق سے ملنا چاہتا ہے۔

ظاہری علوم سے قرآن پاک کی تفہیم ممکن ہے نہ ہی دین کی۔ کتابی علم فلاح کا ضامن نہیں۔ فلسفیانہ موشگافیوں سے دین پر عمل نہیں ہو سکتا صرف ذہنوں کو اُلجھایا جا سکتا ہے۔ اشفاق احمد اسی لیے بابوں کا فیض عام کرنا چاہتے ہیں۔ بابے انسان کو رُوح کی طرف راغب کرتے ہیں اور وہ اللہ کے قریب ہو جاتا ہے یا کم از کم کچھ سکون ضرور پاتا ہے یہ تو انسان کے شوق پر منحصر ہے جتنی محبت ہو گی اتنی قربت ہو گی جسے وہ فراق سمجھے گا وہ بھی قربت کی ہی ایک صورت ہو گی۔ اگر انسان اللہ کے قریب ہونے کی کوشش نہیں کرتا تو پھر وہ حاکموں کے قریب ہو جاتا ہے اور اسی میں اپنی نجات اور فائدہ سمجھتا ہے پھر وہ اندھا، گونگا اور بہرہ بن جاتا ہے۔ اِسی لیے اشفاق قربِ الٰہی کا مشورہ دیتے ہیں۔

> ''میں نوجوانوں سے کہتا ہوں اگر کچھ پانا چاہتے ہیں تو اللہ کے نزدیک ہو جائیں۔''(۲۵)

آج مادے اور سائنس کا دور اپنے عروج پر ہے۔ تاریخِ انسانی شاہد ہے کہ کوئی بھی دُور زیادہ عرصے تک اپنی آب و تاب کے ساتھ باقی نہیں رہتا۔ یہ بھی تجربات اور ماضی کے واقعات سے ثابت ہے کہ ایک زمانے میں جن نظریات کی مخالفت ہو آنے والے ادوار میں وہی نظریات خواص کی پہچان بن جاتے ہیں۔ اِس طرح یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ آنے والا دُور رُوحانیت کا دُور ہو گا جب ماضی کی طرح سادہ طرزِ زندگی ہو گا لیکن انسان اپنے رُوحانی ارتقا کی انتہائی بلند منزل پر ہو گا۔ احادیث سے بھی ثابت ہے کہ آخری دور اسلام کی سربلندی اور حق کی فتح کا دُور ہو گا۔ اشفاق احمد کہتے ہیں:

> ''مستقبل میں زمانہ اُلٹ جائے گا اور جسم کی جگہ رُوح کی کارفرمائی ہو گی۔''(۲۶)

اشفاق احمد کے رُوحانی نظریات پڑھ کے جی چاہتا ہے کہ ہم ایک ایسی بستی کے مکین ہوں جہاں کوئی رسمی تعلیم نہ ہو سبھی علم معرفت رکھتے ہوں، کسی کے دل میں کینہ نہ ہو، حسد نہ ہو، فساد نہ ہو، وہ اُلفتوں کی بستی ہو، جہاں خلوص کے چشمے ہوں، جہاں درندوں کا خوف نہ ہو، جہاں چراغ کی لو سے ایٹمی پاور پلانٹ شرمندہ ہوں۔ دلوں کے نور کی روشنی ہو، جہاں رحمت برستی ہو جہاں مادی تری رُوحِ انسانی کی عظمت کو جھک جھک کے سلام کرے، جہاں لوگ خوددار ہوں، عزتِ نفس عام ہو، جہاں کوئی ریاکار نہ ہو، کوئی مکار، چالاک، مفاد پرست نہ ہو، یقیناً ایسی بستی کہیں موجود ہے۔ اشفاق احمد نے اپنے تصوّرات میں اس کا عکس چھوڑا ہے اور تصوّر اور عکس ہمیشہ حقیقت کا ہی ہوا کرتا ہے لیکن اس تک پہنچنے کے لیے رُوح کے ایٹم کی دریافت شرط ہے اس کے بعد خوشیاں لازوال ہوں گی اور آسانیاں عام۔

☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ خالد سنجرانی، داستان گو عجائب گھر، مشمولہ: پطرس، اشفاق، بانو نمبر، شمارہ ۱۹۹۹ء۔ ۱۹۹۸ء، لاہور: نیو ہوسٹل گورنمنٹ کالج، ص ۱۶

۲۔ بانو قدسیہ، مردِ ابریشم، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۶۲

۳۔ انیس ناگی، بابا صاحبا، تصوف کا روڈ میپ مشمولہ ماہِ نو ماہنامہ، جلد ۶۲، شمارہ نمبر ۷، لاہور: ڈائریکٹوریٹ جنرل آف فلمز اینڈ پبلی کیشنز، جولائی ۲۰۰۹ء، ص ۸۴

۴۔ بانو قدسیہ، راہِ رواں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۴۱۹

۵۔ ایضاً، ص ۴۱۹۔ ۴۲۰ ۶۔ ایضاً، ص ۴۲۰

۷۔ اقبال، اسرار و رموز، لاہور: غلام علی پبلشرز، ۱۹۷۶ء، ص ۱۱۰

۸۔ محمد نواز کھرل (مرتب)، باتوں سے خوشبو آئے، لاہور: زاویہ پبلشرز، ۲۰۱۲ء، ص ۸۱

۹۔ ایضاً، ص ۶۸

۱۰۔ اقبال، بالِ جبریل، لاہور: غلام علی پرنٹرز، ص ۴۳

۱۱۔ سلطان باہو، چنبے دی بوٹی، لاہور: حاجی حنیف پرنٹرز، ۲۰۰۶ء، ص ۹۴

۱۲۔ باتوں سے خوشبو آئے، ایضاً، ص ۸۹

۱۳۔ ایضاً، ص ۹۰۔ ۹۱ ۱۴۔ ایضاً، ص ۹۶۔ ۹۷

۱۵۔ ڈاکٹر طاہر مسعود، یہ صورت گر کچھ خوابوں کے، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص ۲۴۶

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۸۳ ۱۷۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۱۸۔ میر درد، دیوانِ درد، لاہور: مجلس ترقیٔ ادب، س۔ن، ص ۲

۱۹۔ اقبال، ضربِ کلیم، لاہور: غلام علی پبلشرز، ۱۹۸۶ء، ص ۸۳

۲۰۔ باتوں سے خوشبو آئے، ایضاً، ص ۱۴۳

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۴۳ ۲۲۔ ایضاً، ص ۱۴۵

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۴۴

۲۴۔ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، لاہور: کارواں پریس، س ن، ص ۲۵/ ۵۰۳

۲۵۔ باتوں سے خوشبو آئے، ص ۳۴۹ ۲۶۔ ایضاً، ص ۸۵

* * *